© rasailojaraid.com

افسانہ

شیخ حبیب الرحمن بٹالوی

شاخِ نہالِ غم

"جس منحوس کی میں شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ اس کا جنازہ بھی میرے گھر سے نہیں اٹھنا چاہیئے۔ اسکی لاش بھی میرے گھر کیلئے تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔"

چچی نے یہ الفاظ اپنی جواں مرگ بھتیجی کی موت پر اپنے خاوند سے کہے اور ٹسوے بہانے لگی۔

آج سے تیس پینتیس برس پہلے کی بات ہے۔ لاہور شہر سے دور مضافات میں ایک غریب سا گھرانہ آباد تھا۔ گھر کا سربراہ ایک معمولی ملازم تھا۔ اس کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی فوزیہ بی اے کی طالبہ تھی کہ باپ کا سایہ سر سے جاتا رہا۔ چچا کو ترس آیا۔ اور وہ مزید تعلیم کیلئے فوزیہ کو اپنے ساتھ شہر لے آیا۔ بیوی نے شدید مخالفت کی۔ اس کا جینا حرام کر دیا۔ ہر وقت اسکے پیچھے پڑی رہتی۔

"میں اس کی نوکر ہوں؟ سارا دن اسکے کام کرتی رہوں اور یہ نواب زادی بیکار بیٹھی روٹیاں توڑتی رہے۔۔۔۔۔"

ہوتا یہ آیا ہے کہ امیر لوگ غریبوں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ نہیں سکتے۔ دولت مند۔ غریب رشتہ دار کا ہمیشہ مذاق اڑاتے آئے ہیں۔ اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ سرمایہ دار اپنے غلیظ ذوق نفرت کی تسکین کے لئے غریب کا دل ہمیشہ طعن و تشنیع ۔ رخمی کرتے چلے آئے ہیں۔

فوزیہ کی چچی کی اپنی اولاد تو نالائق تھی۔ کوئی بھی بارھویں سے آگے نہ جا سکا تھا۔ سب سے بڑی بچی تو دسویں میں ہی فیل ہو گئی تھی۔ وہ فوزیہ کی تعلیم سے جلتی تھی۔ اور ہر وقت حیلے بہانے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کئے رکھتی۔ آخر ایک دن اس نے اپنے میاں سے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ "مجھ سے اس لڑکی کا کام نہیں ہوتا۔ میں اسے گھر رکھنے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ یہ منحوس لڑکی۔۔۔۔۔۔۔ اسکی نحوست کی وجہ سے میرے گھر میں آئے دن کوئی نہ کوئی مصیبت آئی رہتی ہے۔" الغرض

بجھا کے رکھ دے یہ کوشش بہت ہوا کی تھی
چراغ میں بھی مگر کچھ روشنی انا کی تھی

میاں نے تنگ آکر فوزیہ کو بالائی منزل کا ایک کمرہ علیحدہ دے دیا اور کھانے وغیرہ کیلئے بھی اس کا بندوبست علیحدہ کر دیا گیا۔

فوزیہ کو پتہ نہیں کتنی دفعہ اسکے باپ کی یاد نے ستایا ہوگا۔ کتنی دفعہ احساس محرومی نے اس کا دل کرچی کرچی کیا ہوگا۔ کہ اگر آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو اسے یہ طعنے نہ سننے پڑتے۔

فوزیہ تعلیم میں بہت اچھی تھی۔ دل لگا کر پڑھتی رہی اور آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ایم اے کا آخری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سال آ گیا۔ وہ یونیورسٹی کی ذہین طالبات میں سے ایک تھی۔ ہر کوئی اس کی عزت کرتا تھا۔ یونیورسٹی آ کر وہ چچی کی جلی کٹی باتیں بھول جانے کی کوشش کرتی۔ مگر کہاں تک! باپ کی موت۔ ماں کی پریشانیاں۔ اپنی بے بسی۔ رات دن کی مسلسل محنت اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہی تھی۔

شومئی قسمت! ایک دن فوزیہ کو بیماری نے آ گیا۔ کافی دن وہ یونیورسٹی نہ جا سکی۔ اس کے کلاس فیلو (طلباء و طالبات) اسکی عیادت کیلئے آئے۔ اور اسکے ساتھ اسی کی چچی کا برا سلوک دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ انہوں نے فوزیہ کے علاج معالجے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ مگر قدرت کے آگے کس کی چلی ہے! ٹی بی نے فوزیہ کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ اور یہی مہلک بیماری ایک دن اسکے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ وہ اپنی غم زدہ بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائی کو روتا دھوتا چھوڑ کر عدم آباد جا بسی:

ابھی جام عمر بھرا نہ تھا کف دست ساقی چھلک پڑا
رہیں دل کی دل میں حسرتیں کہ نشان قضا نے مٹا دیا

فوزیہ کی موت پر اسکی چچی نے آسمان سر پہ اٹھا لیا وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

"جس منحوس کی میں شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ اس کا جنازہ بھی میرے گھر سے نہیں اٹھنا چاہیئے۔ اس کی لاش بھی میرے گھر کے لئے تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔"

تیز مرچ اور تیز عورت سے اللہ بچائے۔ فوزیہ کا چچا بے بس تھا۔ آخر فوزیہ کے ساتھی طلباء و طالبات، محلے والوں کے تعاون سے اس کا جنازہ مجبوراً ایک ہمسائے کے گھر اٹھا لائے۔ اسے وہیں نہلایا۔ کفنایا اور وہیں سے اس کا جنازہ اٹھایا۔

فوزیہ کے ساتھی طلباء و طالبات نے اس کی قبر پر جو کتبہ لگایا۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے۔

"یہاں ہماری ساتھی فوزیہ محو خواب ہے۔
ایک ذہین طالبہ
جو امتحان میں اوّل آئی اور امتحان مرگ میں بھی اوّل منتخب ٹھہری۔
ہم نے اپنے ہاتھوں اسے قبر میں اتارا
اور بہت روئے
اس کی ہم نشیں لڑکیوں نے وہ سارے آنسو بہا دیئے جو آنے والے کسی زمانے میں اسکی رخصتی کیلئے رکھے گئے تھے۔

بہر حال
وہ آنسو اسکی رخصتی ہی کے کام آئے"۔

© rasailojaraid.com